# کلامِ اقبال میں فلسفۂ حیات کے نادر پہلو

پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون قادر
Prof. Dr. Muhammad Haroon Qadir
Govt. College University, Lahore.

**Abstract:**

Allama Iqbal was a genius scholar of Muslim Ummah. His poetry reflects his thoughts about this Universe and the role of a man in this word. The concept of death empowers the man to overcome his difficulties. A person should rely on God. A person should use the power to create the new things and thoughts. This power has been granted to a person by God for the betterment of this Universe. In this research article an effort has been made to reveal some aspects of Allama Iqbal's poetry and philosophy.

حیات، کائناتِ بے ثبات کے سربستہ رازوں میں سے ایک ایسا راز ہے کہ جسے اس کائناتِ فانی میں چشم کشا کرنے والی ہر ذی روح و ذی نفس ہستی نے تلاش کرنے کی نہ صرف سعی و جستجو کی بلکہ اسے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے افشا کرنے کی کوششِ ناتمام بھی کی۔ انبیا و رسل سے لے کر بزرگانِ حق تک، فلسفیوں سے لے کر جوتشیوں تک، سائنس دانوں سے لے کر ادبا و شعرا تک سبھی اس کی گتھیوں کو سلجھانے، اس کے رازوں کو پانے اور اس کا پیغام اوروں تک پہنچانے میں مصروف رہے۔ علامہ اقبال بھی اپنے کلام میں حیات کے سربستہ رازوں کو جاننے اور جو کچھ جان پائے اسے افشا کرنے میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ بانگِ درا کی نظم ''کوششِ ناتمام'' کا یہ شعر وہ پہلا شعر ہے جس میں علامہ اقبال نے خضر کی زبانی 'رازِ حیات' افشا کرنے کی سعی کی ہے۔ علامہ اقبال کے کلام میں خضر کا ذکر وسیع معانی میں ہوا ہے۔ وہ اکثر مقامات پر خضر کی زبان میں ہمکلام ہوئے ہیں۔ یہاں بھی وہ مبارک قدم خضر سے رازِ حیات پوچھنے کی تلقین کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیتے ہیں کہ ہر ایک چیز کوششِ ناتمام سے ہی زندگی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ حیات کا راز کوشش میں ہی پنہاں ہے کوشش کا موقوف ہو جانا گویا موت کے مترادف ہے۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ نا تمام سے(۱)
(کوششِ ناتمام: بانگِ درا)

اسی کوششِ ناتمام کو اقبال سعیٔ پیہم سے بھی تعبیر کرتے ہیں کہ زندگی کی تمام تر کیفیات اور اس کی تمام تر مقداروں کا دارومدار جہدِ مسلسل پر ہے جبکہ انسان ابھی تک صبح وشام کے چکر میں پڑا ہوا ہے اور اسی کی کسوٹی پر اپنی سعی کو پرکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی(۲)
(غزل: بانگِ درا)

علامہ اقبال حکیمانہ بصیرت اور قوت افروز متخیلہ سے حیات کے پردوں کو چاک کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے وسیع علم، مشاہدے، وجدان اور متخیلہ نے ان کی آنکھوں سے پردے ہٹا دیے تھے اور ان پر حیات کے راز و نیاز عیاں کر دیے تھے۔ وہ زندگی کی یہ حقیقت پا گئے تھے کہ امید ہی زندگی ہے۔ علامہ اقبال کے عہد میں بہت سے لوگ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر مایوس ہو چکے تھے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ میری آنکھوں پر حیات کے اسرار آشکار ہو چکے ہیں، کہ زندگی پر امید لوگوں کے لیے رواں دواں رہتی ہے اور مایوسوں کے لیے زندگی کا سفر رک جاتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عملی جدوجہد سے مایوس ہو جائیں۔ مسلمان اپنی حیات کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مجھے امید ہے کہ یہ امتِ دوبارہ ضرور مائل بہ عروج ہوگی۔

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات(۳)
(مسلم: بانگِ درا)

علامہ موصوف اپنے اندر درویش، فقیر، مردِ حق، مردِ کامل، قلندر اور مومن کی صفات رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں حیات و ممات کی حقیقتیں اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ آشکار ہیں۔ اللہ کے دوستوں کے لیے موت دراصل دائمی حیات کا پیغام ہوتا ہے، وہ راہِ سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے دل کی آنکھ سے موت کے پردے میں پوشیدہ حیات کو دیکھ لیتے ہیں وہ پیشوائے قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جس شے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً حیات ہی کا ایک رخ ہے اور یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے حقیقت، مجاز میں پوشیدہ ہو، اقبال فرماتے ہیں

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت میں مجاز(۴)

(شفا خانۂ حجاز: بانگِ درا)

نظم 'ارتقا' میں بھی علامہ اقبال نے چند لفظوں میں حیات کی شرح بیان کر دی ہے۔ علامہ اقبال کا تمام تر کلام جہدِ مسلسل کا پیغام ہے۔ وہ زندگی کو کوششِ ناتمام قرار دیتے ہیں ایسی کوشش جو سراسر مشکل کشی اور جفا طلبی سے عبارت ہے۔ جس کی لغت میں نہ آرام کا لفظ ہے نہ سکون کا، نہ ٹھہراؤ ہے نہ تن آسانی۔ جو شعلے کی مانند بھڑکتی ہوئی، قوتِ عمل کو جوش میں لانے والی، غیرت و خودداری کے زیور سے آراستہ اپنے سفر پر تیز رفتاری سے گامزن رہتی ہے۔ آرام و سکون اس کی فطرت سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی(۵)

(ارتقا: بانگِ درا)

اپنی والدہ کی موت پر انہوں نے جو یادگار اور زندہ جاوید نظم لکھی اس میں بھی وہ حیات کو انمٹ نقش قرار دیتے ہیں ایسا نقش جسے موت بھی مٹانے سے قاصر رہتی ہے۔ زندگی نہ صرف ہر انسان کے لیے بلکہ ہر ذی حیات کے لیے ہمیشہ محبوب رہی ہے لیکن علامہ قبال اس نادر خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ زندگی اللہ کی نظر میں بھی اس قدر پیاری ہے کہ اللہ نے ہی ہر شے کی تخلیق کے وقت اس میں زندگی کے تحفظ کا جذبہ بھی شامل کر دیا اور یوں حیات کو موت سے زیادہ طاقت عطا کر دی۔ یہ اسی طاقت کا نتیجہ ہے کہ موت کی ستم ظریفیوں کے باوجود حیات قائم و دائم ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ موت کو یوں عام نہ کرتے۔ حیات دراصل فرائض کے تسلسل ہی کا نام ہے اور اس کی جلوہ گاہ صرف یہ ایک جہان نہیں ہے بلکہ لاکھوں جہانِ بے ثبات اس کی جلوہ گاہ ہیں۔ یہ زندگی لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں رواں دواں ہے۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات(۶)

(والدہ مرحومہ کی یاد میں: بانگِ درا)

نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کا اردو شاعری میں وہی مقام و مرتبہ ہے جو کہ خود ''مسجدِ قرطبہ'' کا تمام مسجدوں میں ہے۔ جس طرح یہ مسجد کمال و فن کا یکتا و نادر نمونہ ہے اسی طرح نظم ''مسجدِ قرطبہ'' بھی علامہ اقبال کے فنی و فکری کمالات کا بے مثل نمونہ ہے۔ وہ جاہ و جلال، وہ شان و شوکت جو ''مسجدِ قرطبہ'' کا خاصا ہے علامہ کی نظم بھی اسی جاہ و جلال کی آئینہ دار ہے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد ہسپانیہ کے

دورہ کے دوران علامہ اقبال مسجدِ قرطبہ کی زیارت کو بھی گئے۔ صدیوں بعد مسجد کے در و دیوار نے علامہ اقبال کی آواز میں اذان سنی۔ اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر علامہ نے شہرہ آفاق نظم ''مسجدِ قرطبہ'' تخلیق کی۔ علامہ نے اپنی اس نظم میں 'حیات' کی رنگا رنگ صورتوں میں جلوہ نمائی کے مختلف مظاہر کی منظر کشی بڑے دلفریب انداز میں کی ہے۔ نظم کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے کہ:

سلسلۂ روز و شب ، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصلِ حیات و ممات(۷)

علامہ کے نزدیک شب و روز کا سلسلہ دراصل زمانے کی ایک رو ہے، یہی سلسلہ زندگی اور موت کا سرچشمہ ہے اور اسی سے حیات و موت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ کلامِ اقبال میں 'تصورِ عشق' وضاحت و صراحت سے ملتا ہے۔ اقبال نے خودی کی طرح عشق کو بھی نئے مفاہیم کا لباس پہنایا۔ اقبال کے ہاں عشق دمِ جبریل بھی ہے اور دلِ مصطفیٰ بھی۔ عشق خدا کا رسول بھی ہے اور خدا کا کلام بھی۔ کہیں عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے اور کہیں قوتِ عشق سے پست بھی بالا ہو جاتے ہیں۔ اسی سے مردِ خدا کا عمل فروغ پاتا ہے۔ اسی لیے اقبال عشق کو حیات کی اصل قرار دیتے ہیں یہ زندگی کا ایسا جوہر ہے جو موت کی دسترس سے باہر ہے۔ اگر حیات کو ایک ساز خیال کر لیا جائے تو عشق اس ساز کے لیے مضراب کی حیثیت رکھتا ہے ایسا مضراب جس کی بدولت نغمے بکھرتے ہیں۔ یہی عشق زندگی کو تابانی بخشتا ہے اسے تاریکیوں سے نکال کر منور کرتا ہے۔ اسی سے حیات حرارت پاتی ہے اور اس میں جلال و جمال پیدا ہوتا ہے۔ اقبال، حیات کے لیے انقلاب کو لازم قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک ایسی زندگی موت سے بھی بدتر ہے جو تغیر و تبدل سے عاری ہو۔ یہاں تک کہ قوموں کی زندگی بھی اسی انقلاب سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ قومیں بہت جلد موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں جو انقلاب کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتی ہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ!
عشق ہے اصلِ حیات ، موت ہے اس پر حرام(۸)

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات ، عشق سے نارِ حیات(۹)

جس میں نہ ہو انقلاب ، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب(۱۰)
(مسجدِ قرطبہ: بالِ جبریل)

خودی ،کلامِ اقبال کا ایک ایسا گوہرِ نایاب ہے جس کی چمک دمک پوری آب و تاب سے اقبال کے چاہنے والوں کی نظروں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔علامہ نے خودی کی تفہیم حضرت علی کے اس قول کی روشنی میں کی ہے کہ 'جس نے خود کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا'۔علامہ کے ہاں خودی اور حیات ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔خودی علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات کی بنیادی کڑی ہے۔کلامِ اقبال میں خودی کہیں تو حیات ہی کا دوسرا نام ہے اور کہیں وہ اسے عشق کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی خودی کیا شے ہے اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ ہے۔انہوں نے مختلف موقعوں پر اس کے الگ الگ (گو ایک دوسرے سے قریب قریب) معنی بیان کیے ہیں۔مثلاً خودی حیات کا دوسرا نام ہے۔خودی عشق کے مترادف ہے۔خودی ذوقِ تسخیر کا نام ہے۔خودی سے مراد خود آگاہی ہے۔خودی عبارت ہے ذوق استیلا سے۔خودی ذوقِ طلب ہے۔خودی ایمان کے مترادف ہے۔خودی سرچشمہ جدت وندرت ہے۔خودی یقین کی گہرائی ہے۔خودی سوزِ حیات کا سرچشمہ اور ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔غرض اس قسم کے گاناگوں معانی وصفات خودی سے وابستہ ہوئے ہیں۔ یہ سب اثبات خودی کی صورتیں ہیں جو ہر چیز کو ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف محرک ثابت ہو رہی ہیں۔''(۱۱)

حیات اور خودی کی تفہیم کے لیے علامہ اقبال استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔شعر کے نصف مصرعے میں وہ حیات کے اسرار و رموز جاننے کے لیے سوال کرتے ہیں اور باقی نصف مصرعے میں اپنی فلسفیانہ و عالمانہ اپج سے کام لے کر حیات کے سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی سعی کرتے ہیں۔

حیات کیا ہے ؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں(۱۲)
(غزل :بالِ جبریل)

اقبال،حیات کو انمٹ نقش قرار دیتے ہیں جو مٹ مٹ کر ابھرتا ہے۔ان کے نزدیک حیات کو بے ثبات خیال کرنا سراسر نادانی ہے۔ساقی نامہ کے درج ذیل اشعار میں وہ خودی کی تفہیم کرتے ہوئے اسے زندگی کے بحرِ بیکراں کی موجوں میں پنہاں راز قرار دیتے ہیں۔خودی کے راز کو پانے کے لیے حیات کے سمندر میں غوطہ زن ہونا لازم ہے اور اس غوطہ زنی کے نتیجے میں کائنات بیدار ہو جاتی ہے اور اس کے اسرار نہاں خانوں سے نکل کر عیاں ہونے لگتے ہیں۔

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مِٹ مِٹ کے نقشِ حیات(۱۳)

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات(۱۴)
(ساقی نامہ: بالِ جبریل)

علامہ اقبال کی نظم ''تیاتر'' میں ان کے تصورِ خودی اور فلسفۂ حیات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔'تیاتر' کے لغوی معنی تھیٹر کے ہیں۔اقبال کے نزدیک تھیٹر میں کام کرنے والا محض نقال بن کے رہ جاتا ہے اور یہ نقالی خودی کے منافی ہے جو انسان کو زندگی کو حقیقتوں سے دور لے جاتی ہے۔اقبال خودی کو ایک نور سے تعبیر کرتے ہیں جس سے 'حریمِ وجود' روشن ہوتا ہے۔حیات اسی خودی کا سرور بھی ہے اور سوز بھی اور اسی سے وہ ثبات پاتی ہے۔تمثیل یعنی ڈرامے کا کمال یہی ہے کہ اس سے انسان کی ذات کی نفی ہوتی ہے اور اگر ذات کی نفی ہو جائے تو خودی کا وہ سوز باقی نہیں رہتا جو کہ انسان کو کندن بناتا ہے اور زندگی کا ساز بھی خاموش ہو جاتا ہے گویا کہ حیات کا حسن، اس کا وقار، اس کی عظمت، اس کا ثبات سبھی کچھ خودی سے عبارت ہے۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے ؟ اسی کا سرور و سوز وثبات(۱۵)

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو ، تو نہ سوزِ خودی ، نہ سازِ حیات(۱۶)
(تیاتر، ضربِ کلیم)

نظم ''مقصود'' میں بھی علامہ اقبال نے خودی اور حیات کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے حیات کے بارے میں تین مشہور فلسفیوں کی زبانی تین مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ پہلا فلسفی 'سپنوزا' ہے جو کہ سترھویں صدی عیسوی کا ولندیزی فلاسفر تھا۔وہ عقل مند کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ وہ ہمیشہ حیات پر نظر رکھتا ہے اور حیات ہے کیا؟ خدا کی حضوری حاصل کرنا۔پھر اس حضوری سے مستی و کیف کا حصول ممکن بنانا اور حقیقت تک راہنمائی کی روشنی حاصل کرنا اور اپنے وجود کی حقیقت کو پانا کہ یہ موجود ہے۔دوسرا فلسفی افلاطون ہے جس کا تعلق قدیم یونان سے ہے وہ سپنوزا کے برخلاف حیات کا مختلف نظریہ پیش کرتا ہے کہ عقلمند انسان کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ موت پر نظر رکھتا ہے کیونکہ موت ایک تاریک رات میں چند لحظے چمکنے والی چنگاری کی مانند ہے، جس طرح چنگاری جلنے کے بعد چند لمحوں میں

بجھ جاتی ہے اسی طرح زندگی بھی نا پائیدار اور عارضی ہے جبکہ موت ہمیشہ کی زندگی ہے۔حیات کے بارے میں تیسرا نظریہ خود اقبال کا ہے ان کے مطابق حیات اور موت دونوں ہی لائقِ توجہ نہیں ہیں صرف خودی ہی لائقِ التفات ہے کیونکہ اسی سے زندگی عبارت ہے۔خودی دراصل خود معرفتی ہے اگر انسان کا مقصود خودی ہو تو حیات اور موت دونوں اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔

**سپنوزا**

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود(۱۷)

**افلاطون**

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود(۱۸)

.....

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود(۱۹)

علامہ اقبال کی نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیات میں بھی فلسفۂ حیات کی مختلف جھلکیاں ملتی ہیں۔انسان خاص طور سے بندۂ مومن کا مقام ہر ایک مقام سے آگے ہے لیکن یہ بلند مقام اسی صورت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان حیات کے اس راز سے آشنا ہو جائے کہ زندگی 'ذوقِ سفر' سے عبارت ہے۔اور ذوقِ سفر کیا ہے یہ سعیٔ پیہم اور کوششِ ناتمام ہی کی ایک صورت گری ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں(۲۰)
(غزل:بالِ جبریل)

اس شعر میں علامہ اقبال نے کمال مہارت اور حکیمانہ بصیرت سے حیات سے متعلق تمام تر علمِ قلندری کا خلاصہ صرف چند الفاظ میں پیش کر دیا ہے کہ حیاتِ انسانی ہو یا حیاتِ کائنات اس کا تعلق ہر صورت میں نورِ مطلق کے سرچشمہ سے ضرور رہتا ہے اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جس طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کا رابطہ کسی نہ کسی صورت کمان سے قائم رہتا ہے۔اس شعر میں نظریہ وحدت الوجود کی جھلک نمایاں ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد بھی انسان کی حیات کا تعلق اور ربط اپنے خالق سے ضرور رہتا ہے۔یعنی حیات کو خالق سے جدا کر کے دیکھنے کی سعی محض سعیٔ لاحاصل ہے۔

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری ، کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں(۲۱)
(غزل: بالِ جبریل)

علامہ اقبال کا شمار صفِ اول کے ان شاعروں، فلسفیوں، مفکروں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو اپنی حیات میں ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے اور ان کی آواز مشرق و مغرب کے ساز پر نغمے بکھیرنے لگی تھی۔ ۱۹۲۴ میں جب اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ''بانگِ درا'' منظرِ عام پر آیا اس کے دیباچہ میں شیخ عبدالقادر نے ان کو ان لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

> ''کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا، جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالہ اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے، اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے، مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا، جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔''(۲۲)

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اربوں کھربوں انسانوں میں سے ہمیشہ وہی لوگ حیاتِ دائمی پانے میں کامیاب ہوئے ہیں جو حیات کے بھیدوں کو پا لینے والے تھے۔ اقبال کا شمار بھی دنیا کی ان عظیم المرتبت ہستیوں میں ہوتا ہے جو بحرِ حیات کی ایک ایک موج کو چھو کر، ایک ایک گوہر سے دامن بھر کر حیات کے رازوں سے آشنا ہو چکے تھے، انہوں نے حیات کا رازِ دروں جب شعروں کی صورت عوام و خواص تک پہنچایا تو سبھی نے اپنی اپنی استطاعت اور دانست کے مطابق اسے لبیک کہا۔

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات(۲۳)
(نویدِ صبح: بانگِ درا)

## حوالہ جات


۱۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص:۱۵۰
۲۔ ایضاً، ص:۳۱۱
۳۔ ایضاً، ص:۲۲۴
۴۔ ایضاً، ص:۲۲۶

۵۔ ایضاً،ص:۲۵۱

۶۔ ایضاً،ص:۲۵۴

۷۔ ایضاً،ص:۴۱۹

۸۔ ایضاً،ص:۴۲۰

۹۔ ایضاً،ص:۴۲۱

۱۰۔ ایضاً،ص:۴۲۸

۱۱۔

۱۲۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص:۳۶۴

۱۳۔ ایضاً،ص:۴۵۵

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً،ص:۶۱۸

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً،ص:۵۸۲

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً،ص:۳۷۸

۲۱۔ ایضاً،ص:۳۸۰

۲۲۔

۲۳۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص:۲۴۰

☆.....☆.....☆